علامہ اقبال کی نظم ''داغ'' کا ایک جائزہ

ڈاکٹر محمد محسن
کروڑی مل کالج، دہلی یونیورسٹی، دہلی

ملخص:۔ علامہ اقبال کی نظم 'داغ' ایک مشہور ترین مرثیہ ہے جو حضرتِ داغ کی وفات پر لکھی گئی۔ علامہ اقبال کو داغ دہلوی سے بے حد الفت تھی۔ جن کی موت پر اس نظم میں دردانگیز کلام تحریر کیے ہیں۔ انہوں نے پوری نظم میں حضرتِ داغ کی شاعری کی خصوصیات پر اپنے نظریے کا اظہار کیا ہے ۔ حضرت داغ کی شاعری کے حسن و جمال، بلند پروازی، باریک بینی اور حسنِ بیان وغیرہ پر تفصیل سے علامہ اقبال نے روشنی ڈالی ہے۔ داغ کی رحلت پر اپنے تأسف کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ داغ جیسے بلند مقام شاعر کے رخصت ہو جانے سے دہلی کی شعر و شاعری کی محفلیں ویران ہو گئی ہے۔ مزید یہ کہ حضرتِ داغ جیسے بڑے شاعر کو بھی فکرِ معاش میں ہندوستان کے کئی شہروں کا سفر کرنا پڑا اور آخر میں حیدرآباد (دکن) میں آباد ہو گئے تھے اور ہمیشہ ہمیش کے لیے اسی مٹی کے ہو کر رہ گئے۔ اس طرح ولایت میں ہی دارِ فانی سے دارِ باقی کی طرف کوچ کر گئے اور وہیں ان کی تدفین بھی عمل میں آئی۔ بہر حال اس نظم میں علامہ اپنے استادِ محترم حضرت داغ کی وفات پر خراجِ پیش کیے ہیں اور ان کی موت پر اپنے جذبات کا شدت سے اظہار کرتے ہوئے اشک کے دانے بکھیرے ہیں۔

کلیدی الفاظ: نظم۔ علامہ اقبال۔ حضرتِ داغ دہلوی۔ شاعر نوحہ۔ دہلی۔ تخیل۔ حسن۔ جمال

شاعرِ مشرق علامہ اقبال اردو شاعری کے ایک عظیم المرتبت شاعر ہیں جو خاص و عام میں تسلیم کیے جاتے ہیں۔ انہیں شاعرِ مشرق کے ساتھ ساتھ حکیم الامت کے لقب سے بھی جانا جاتا ہے۔ ان کو حکومت کی جانب سے ۱۹۲۳ء میں 'سر' کے خطاب سے نوازا گیا۔ انہوں نے غزل اور نظم دونوں صنفوں میں طبع آزمائی کی ہے۔ ان کی غزلیں نظم نما اور نظمیں غزل نما ہیں۔ انھیں اردو نظم نگاری میں بے پناہ شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی جو کسی دوسرے شاعر کو نصیب نہیں ہوئی۔

علامہ اقبال نے بھی اپنی شاعری کا آغاز عام شعرا کی طرح ہی روایتی غزل گوئی سے کیا ہے۔ جس وجہ سے ان کی ابتدائی شاعری کا میلان اردو غزل گوئی کی جانب اچھا خاصا رہا ہے۔ اپنی شاعری کی اصلاح داغ دہلوی سے خط و کتابت کے ذریعے کیا کرتے تھے اس زمانے میں حضرت داغ دہلوی حیدرآباد (دکن) میں ذریعۂ معاش کی خاطر مقیم تھے۔ زیادہ دنوں تک استادی اور شاگردی کا یہ سلسلہ نہیں چل سکا کیوں کہ استادِ محترم حضرات داغ

دہلوی نے جلد ہی یہ لکھا کہ آپ کی شاعری میں اصلاح کی زیادہ گنجائش نہیں ہے۔ اس لیے ان کی ابتدائی شاعری میں حضرت داغ دہلوی کا رنگ نمایاں ہے۔ ان کی ابتدائی شاعری میں امیر مینائی کے اثرات بھی نظر آتے ہیں۔

علامہ اقبال ایک پیامی شاعر تھے انھیں اپنے جذبات و فکر کو قوم وملت تک بہ حسن وخوبی پہنچانا تھا کیوں کہ صنفِ غزل میں اشاروں اور کنایوں سے کام لیا جاتا۔ اس کے برعکس صنفِ نظم میں اپنی بات کو تفصیلی وضاحت کے ساتھ پیش کیا جاسکتا ہے جو غزل میں ممکن نہیں یہی وجہ ہے کہ وہ غزل سے نظم کی طرف مائل ہوگئے۔ دراصل انہوں نے شاعری کا اس لیے انتخاب کیا تھا کہ انہیں اپنے خیالات و نظریات کے ذریعہ قوم وملت کو بیدار کرنا تھا جس کو وہ ناگزیر سمجھتے تھے اور غیر معمولی کام کو سہل نگاری کے ساتھ انجام دیا جو دوسرے شعراء کے یہاں تشنہ ہے۔ یہی فطری وجہ ہے کہ علامہ اقبال کی شاعری کا اصل میدان نظم کی دنیا ہے۔ بانگِ درا ان کا پہلا شعری مجموعہ ہے جو ۱۹۲۴ء میں پہلی مرتبہ منظرِ عام پر آیا۔

زیرِ غور نظم داغ جو بانگِ درا میں شامل ہے یہ نظم پانچ حصوں پر مشتمل ہے پہلے حصے میں پانچ اشعار، دوسرے حصے میں چار اشعار، تیسرے حصے میں چھ اشعار، چوتھے حصے میں پانچ اشعار اور آخری حصے میں صرف تین اشعار درج ہیں۔ اس طرح نظم میں کل ۲۳ اشعار شامل ہیں۔

حضرت داغ دہلوی کی سند کے اعتبار سے ان کا اصل نام نواب مرزا ابراہیم خاں اور ان کا تخلص داغ تھا۔ لیکن قلعۂ معلیٰ میں نواب مرزا خاں کے نام سے مشہور و معروف ہوئے آپ کی پیدائش دہلی میں ۲۵ مئی ۱۸۳۱ء کو ہوئی لیکن ذریعۂ معاش کی خاطر حیدرآباد (دکن) میں آباد ہوگئے تھے وہیں ۷۴ سال کی عمر میں ۱۷ مارچ ۱۹۰۵ء کو اس دارِ فانی سے دارِ بقا کی طرف ہمیشہ ہمیش کے لیے رخصت ہوگئے۔ حضرت داغ دہلوی صرف ۶ سال کے ہی تھے کہ ان کے والدِ محترم نواب شمس الدین خاں کی وفات ہوگئی اور وہ کم سنی میں ہی یتیم ہوگئے والد کے انتقال کے بعد ان کی والدہ کی دوسری شادی بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے صاحبزادے مرزا فخرو سے ہوگئی تھی جس وجہ سے ان کی پرورش و پرداخت قلعۂ معلیٰ میں خاص توجہ کے ساتھ ہونے لگی

داغ دہلوی تلاشِ معاش کی فکر میں اپنے وطن سے ہجرت کر کے رام پور کی سرزمین کا رُخ کیا لیکن قیام رام پور میں ان کا دل نہیں لگا چونکہ قدرت کو منظور کچھ اور ہی تھا۔ دل اُچٹ جانے کے بعد وہاں سے اجمیر (راجستھان) میں آکر آباد ہوگئے یہاں آکر انہوں نے کسی ولی کامل کے آستانے پر اپنی حاضری پیش کی اور پھر آستانے کے ستونوں سے لگ کر اپنی شاعری کے پردے میں اپنے احساس وجذبات کو ایسے درد انگیز طریقے سے بیان کیا کہ خود

پر بھی وجد کی کیفیت طاری ہوگئی تھی اور سامعین بھی متاثر ہو کر زار و قطار رونے لگے تھے۔ اجمیر میں زیادہ دنوں تک قیام نہیں رہا جلد ہی حیدرآباد دکن کا رُخ کیا اور وہاں میر محبوب علی خاں نظام کے استاد مقرر ہوئے۔ یہاں ان کی مکمل زندگی بڑی مسرت و شادمانی سے گزری۔ آخر کار ۷۴ سال کی عمر میں وہیں اپنے محبوبِ حقیقی سے جا ملے۔

اردو شعر و شاعری میں حضرت داغ دہلوی کو استاد کی حیثیت سے دیکھا جاتا ہے انہوں نے اردو شاعری میں جو روایت سوداؔ، ذوقؔ اور غالبؔ نے جنم دیا تھا۔ اس روایت کو داغ نہ صرف آگے بڑھانے میں پیش پیش رہے بلکہ اس روایت میں حسن و جمال کا بھی اضافہ فن کارانہ انداز سے کیا۔ داغ دہلوی غالب کے عظیم ترین شاگرد تھے۔ اپنی شاعری کو معیاری بنانے کے لیے وہ اکثر غالب سے اصلاح لیا کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اردو غزل کو ایک بلند مقام عطا کیا اور آج انھیں اردو غزل کا مسلم شاعر تسلیم کیا جاتا ہے۔ اردو شاعری میں علامہ اقبال حضرتِ داغ دہلوی کے شاگرد تھے۔ انہوں نے بھی اپنی ابتدائی شاعری میں استاد کے رنگ کو ہی نمایاں کیا۔ بعد ازاں علامہ اقبال نے اپنے پیغام کو لوگوں تک پہنچانے کے لیے غزل سے نظم کی جانب مائل ہوگئے۔ یہ بات ضرور ہے کہ وہ بنیادی طور پر نظم کے شاعر ہیں لیکن انھوں نے غزل سے پوری طرح کبھی انحراف نہیں کیا۔ بہر حال اردو غزل میں جو روایت داغ نے قائم کی اسی روایت کو فلسفیانہ طور سے علامہ اقبال نے بھی نئی نسل کو روشناس کرایا۔

مذکورہ بالا باتوں کے علاوہ استاد الشعرا حضرت داغ دہلوی کی سب سے نمایاں خصوصیات ان کی زبان کے حسن و جمال ہیں۔ یہی حسن و جمال ان کی غزل کو ان کے تمام ہم عصر شعراء میں فوقیت و برتری حاصل کراتی ہیں۔ اردو شاعری کو انہوں نے ثقیل و مشکل بندشوں اور ترکیبوں سے پاک کیا جو ان کا ایک جاوداں کارنامہ ہے۔ اردو غزل گوئی میں فارسی و عربی کے گھسے پٹے، فرسودہ اور غیر مانوس الفاظ کا استعمال ہوتا رہا ہے۔ جس سے انھوں نے نجات دلائی اور اپنے نظریات و خیالات کو سادہ اور سلیس زبان میں پیش کیا۔ اس طرح انہوں نے اپنی زبان کو ظاہری نمائش سے بھی پاکیزہ رکھا۔

زیر گفتگو نظم داغ میں علامہ اقبال نے اپنے استاد محترم حضرت داغ دہلوی پر ایک نوحہ تحریر کیا ہے۔ جس کا آغاز انہوں نے بڑے ہی فنکارانہ و جاذبیت کے ساتھ کیا ہے جو بے مثال ہے۔ نظم کا پہلا حصہ تمہید یہ حصہ ہے جس میں انھوں نے غالب اور ان کے عظیم ترین شاگرد میر مہدی مجروح اور داغ دہلوی کے ہم عصر شاعر امیر مینائی جو اس فانی دنیا سے جاودانی دنیا کی طرف منتقل کر گئے تھے، انہیں شعراء سے عقیدت کی بنا پر نظم کے پہلے حصے میں درد و غم کا اظہار پر اثر انداز میں تحریر کیا ہے۔ یہاں مذکورہ بالا تینوں شعراء کا اجمالی تعارف پیشِ خدمت ہے۔

مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ کی پیدائش ۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء میں کالا محل آگرہ میں ہوئی۔ مرزا غالب کے آباواجداد سمرقند سے ہجرت کر کے مغل شہنشاہ احمد شاہ بہادر کے عہدِ حکومت ہندوستان میں آباد ہوئے۔ ان کے دادا مرزا قوقان بیگ ہندوستان آنے کے بعد کچھ عرصہ لاہور میں قیام پذیر رہے۔ چند ہی دنوں بعد دہلی کے شاہی دربار میں ملازمت مل گئی تھی لیکن یہ سلسلہ زیادہ دنوں تک نہیں چل سکا۔ وہ ملازمت سے استعفیٰ دے کر دہلی سے جے پور ہجرت کر گئے۔ وہاں انہوں نے مہاراجہ جے پور کے دربار میں نوکری اختیار کر لی اور آگرہ میں آباد ہو گئے یہاں مرزا غالب کے والدِ محترم کا نکاح آگرہ کے ایک معزز خاندان کے ایک فوجی افسر خواجہ غلام حسین کی شہزادی عزت النساء بیگم سے عمل میں آئی۔ مرزا غالب کے چھوٹے بھائی مرزا یوسف علی بیگ خاں کا جنم ۱۷۹۹ء میں ہوا تھا جو ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگِ آزادی میں شہید ہو گئے۔ ان کے والد مرزا عبد اللہ بیگ خاں جو ریاستِ الور میں ملازمت کر رہے تھے وہاں راج گڑھ کے کسی مقام پر ایک جھڑپ میں اپنی زندگی قربان کر دی۔ والد کے گزر جانے کے بعد مرزا غالب کی پرورش کی ذمہ داری اب ان کے چچا مرزا نصر اللہ بیگ خاں کے سپرد ہوئی۔ ۱۸۰۶ء میں مرزا نصر اللہ بیگ خاں کی بھی وفات ہو گئی۔

مرزا غالب کو شاعری کا ذوق و شوق بچپن سے ہی تھا۔ جب وہ صرف گیارہ سال کو پہنچے تھے تبھی اپنی شاعری کا آغاز کیا، کم سِنی ہی میں انہوں نے فارسی و عربی زبان پر عبور و مہارت حاصل کر لی تھی۔ ابتدائی دور میں غالب پہلے تخلص 'اسد' استعمال کرتے تھے لیکن ۱۸۱۶ء کے بعد تخلص اسد کے بجائے 'غالب' بطور تخلص اختیار کر لیے۔ غالب کی شاعری میں جہاں 'اسد' تخلص ہے وہ مشکل پسند شاعری ہے اس کے برعکس جہاں انہوں نے بطور تخلص 'غالب' استعمال کیا ہے وہ خاصا آسان ہے جو تادمِ حیات قائم رہا۔

مرزا اسد اللہ خاں غالب کی شادی ۱۳ سال کی عمر میں ۱۸۱۰ء میں امراؤ بیگم نامی ایک خاتون سے ہوئی جو نواب الٰہی بخش خاں معروف کی شہزادی تھی۔ نواب صاحب خود ایک بڑے شاعر تھے جس سے مرزا غالب کو ایک ادبی ماحول نصیب ہوا۔ ان کے بچپن کی زندگی بڑے ہی آرام و سکون سے گذری لیکن ازدواجی زندگی کے بعد ان کے مالی حالات بہتر نہیں رہے۔ اسی دشوار کن حالات سے قاصر ہو کر دہلی میں سکونت اختیار کر لی۔ مرزا غالب تادمِ حیات دہلی ہی میں مقیم رہے اور ۷۲ سال کی عمر میں ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء کو اس فانی دنیا سے لافانی دنیا کی طرف ہمیشہ ہمیش کے لیے رخصت ہو گئے۔

مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ اردو کے تمام بڑے شعرائے کرام کے درمیان ایک عظیم مقام کے حامل تھے ان جیسا بلند فکر شاعر شاید ہی کسی اور زبان کے حصے میں آیا ہو۔ غالب کی شاعرانہ عظمت کا اصل عنصر یہ ہے کہ انہوں نے اردو شاعری کو پہلی بار فکر سے روشناس کرایا۔ ان سے پہلے اردو شاعری لفظ پرستوں کے ہجوم کے تابع تھی۔ اردو شاعری کی دنیا عاشق و معشوق کی عشقیہ واردات تک محدود تھی غالب کی غزل میں کوئی منظم فلسفہ نظر نہیں آتا چونکہ وہ ایک فلسفی شاعر نہیں تھے لیکن وہ ایک عالمانہ زاویۂ نگاہ ضرور رکھتے تھے جو ان کو ایک مسلم آفاقی شاعر بناتا ہے۔ یوں تو ہر بڑے شاعر کے یہاں فلسفیانہ نظریات کا اظہار ملتا ہے جو غالب کے یہاں بھی موجود ہے۔ غالب کی شاعری کی سب سے بڑی خصوصیت تہہ داری ہے جو ان کی شاعری

میں کثرت سے دکھائی دیتی ہے۔ تہہ داری کا مفہوم یہ ہے کہ شعر میں ایک سے زائد معانی موجود ہوں۔ جب کسی شعر کو پہلی مرتبہ پڑھا جائے تو اس سے ایک تشریح حاصل ہو جب دوسری مرتبہ بغور مطالعہ کیا جائے تو اسی شعر کی جہت سے دو یا زائد تشریحات بھی فراہم ہوں۔ یہ تہہ داری صرف غالب کے یہاں ہے اور کسی دیگر شعراء کے یہاں دور دور تک نظر نہیں آتی۔ غالب کا فلسفیانہ نظریہ ان کی شاعری کے آفاقی عناصر اور تہہ داری یہ تمام شے ان کی شاعرانہ عظمت کے دلائل ہیں۔

میر مہدی مجروح کا شمار مرزا غالب کے عظیم ترین شاگردوں میں ہوتا ہے۔ مرزا غالب تمام شاگردوں کے درمیان انہیں عزیز رکھتے تھے۔ اس طرح شاگردوں کے مابین انھیں فوقیت بھی حاصل تھی۔ مزید یہ کہ غالب انھیں اپنا فرزند ہی گردانتے تھے۔ یہی وجہ رہی کہ مرزا غالب نے زیادہ تر خطوط انہیں کے نام تحریر فرمائے ہیں۔ میر مہدی مجروح (۱۸۳۳۔۱۹۰۳) کی آفرینش دہلی کے ایک محلہ اردو بازار میں ہوئی تھی۔ ان کے بزرگوار ایران سے ہجرت کر کے ہندوستان تشریف لا کر دہلی کو جائے مسکن بنایا۔ یہ خاندان علم و فضل سے بہرہ مند تھا جس کے سبب مجروح کی ابتدائی تعلیم کا درس گھر سے ہی مکمل ہو چکا تھا۔ ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگِ آزادی کے سبب دہلی میں ہر جگہ فتنہ و فساد کا بول بالا تھا۔ ایسے ہی حالات میں مجروح بھی دہلی چھوڑنے پر مجبور ہو گئے اور پانی پت آ کر بس گئے۔ حالی ان کے اچھے دوست تھے۔ انہوں نے اپنا گھر رہنے کو میسر کیا، کچھ وقت گزر جانے کے بعد مجروح یہاں بیمار رہنے لگے تھے اور جب دہلی کا ماحول رہنے کے موافق ہوا تو دہلی واپس آ گئے۔ مرزا غالب کی عنایت و کرم سے الور کے مہاراجہ شیو دھیان سنگھ انھیں اپنے ہاں ملازمت دے دی۔ کچھ مدت بعد مجروح تلاشِ معاش میں جے پور آ گئے۔ راجہ سوائی سنگھ نے انہیں نائب کوتوال کے عہدہ سے سرفراز کیا۔ کئی سال گزر جانے کے بعد انہوں نے دہلی کا رُخ کیا اور ملازمت کی دنیا سے آزاد ہو گئے۔ اسی اثنا ان کے اقتصادی حالات خراب ہو گئے۔ والیٔ رام پور کے نواب حامد علی خاں نے ان کے لیے چالیس روپیے ماہوار وظیفہ مقرر کر دیا۔ یہ زمانہ ان کی زندگی کا آخری زمانہ تھا۔ میر مہدی مجروح نے کئی شعرائے کرام کے سائے میں زندگی بسر کی تھی۔ اس لیے ان کی شاعری میں ان تمام شعراء ذوقؔ، مومنؔ، شاہ نصیرؔ، آزردہؔ، شیفتہ اور صحبائی کے رنگ نمایاں رہے ہیں۔ لیکن مرزا غالب کے شاگرد ہونے کے باوجود بھی ان کی شاعری میں ان کا رنگ نظر نہیں آتا مجروح کی نثر میں استاد مرزا غالب کا اندازِ تحریر ضرور دیکھا جا سکتا ہے۔

امیر مینائی کا اصل نام امیر احمد تھا ان کی پیدائش ۱۸۲۸ء کو لکھنؤ میں ہوئی تھی۔ والد مولوی کرم احمد نہایت ہی شریف النفس انسان تھے۔ زمانے بھر میں مشہور و معروف ولی اللہ مخدوم شاہ مینا اور ان کے دادا دونوں سگے بھائی تھے۔ اسی مناسبت سے وہ مینائی سے مقبول ہوئے ابتدائی تعلیم گھر پر ہونے کے ساتھ ساتھ فارسی و عربی کا درس استاد مفتی سعد اللہ مراد آبادی سے حاصل کیا۔ شاعری کا ذوق و شوق کم سنی میں ہو گیا تھا۔ اس زمانے میں اردو شاعری کے مشہور استاد منشی مظفر علی اسیر سے انہوں نے شاعری کا سبق حاصل کیا۔ امیر سے اصلاح کے بعد خاص و عام میں ان کی شاعری کی

دھوم مچ گئی اور وہ بذاتِ خود ایک مسلم الثبوت استاد کہلائے۔ اسی شہرت کی بنا پر نواب واجد علی شاہ نے تعلیم کی خاطر انہیں اپنے خونِ جگر صاحبزادے کے واسطے اتالیق مقرر کیا۔ بد قسمتی ان کی یہ رہی کہ پہلی جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء میں رونما ہوئی تھی جس کے سبب ہر طرف ہنگامہ ہی ہنگامہ تھا۔ آخر میں لکھنؤ سے ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے اور رام پور میں آکر سکون کی سانس لی۔ یہاں والیٔ رام پور میں انھیں عدالتِ دیوانی اور مفتی شریعت کے ایک رکن کے عہدے کی ذمہ داری عطا کی گئی۔ تبدیلیٔ والیٔ رام پور کے بعد ان کی تنخواہ میں کمی آگئی تھی جس وجہ سے گزارا مشکل ہو گیا تھا۔ امیر مینائی سے انیست رکھنے والے ان کے خاص دوست حضرت داغ دہلوی حیدر آباد (دکن) جاکر بس گئے تھے وہاں ان کی زندگی میں خوشی وشادمانی آگئی تھی انہیں کے مشورے سے امیر مینائی حیدر آباد (دکن) تشریف لے گئے لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ وہاں ایسی شدید بیماری میں مبتلا ہوئے کہ انہیں افاقہ نہ مل سکا اور ۱۳؍ اکتوبر ۱۹۰۰ء میں وہیں وفات ہو گئی۔

امیر مینائی اردو شعر وادب میں ایک منفرد مقام رکھتے تھے۔ وہ اپنے تمام ہم عصر شعراء میں سرِ فہرست تھے۔ ان کی غزل میں فصاحت وبلاغت دونوں عناصر موجود ہیں جو ان کی شاعری کے حُسن وجمال میں خاصا اضافہ کے باعث ہیں۔ ان کی شاعری میں دبستانِ لکھنؤ کی خارجیت کے ساتھ ساتھ دبستانِ دہلی کی داخلیت اس طرح نظر آتی ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ دونوں اسکول کے امام ہوں۔ ان کی شاعری رنگ برنگ پھولوں اور حسین وجمیل امتزاج کا ایک گلدستہ ہے جو دوسرے ہم عصر شعراء کے یہاں ناپید ہے۔ تاہم انہوں نے مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی ہے اردو غزل میں جو مقام انھیں حاصل ہے وہی مقام قصیدہ نگاری ونعتیہ کلام میں قدرت نے انھیں بخشا ہے۔

اس نظم کے تیسرے حصے کے تیسرے شعر میں حافظ شیرازی کا ذکر ہوا ہے۔ اس لیے یہاں ان کا مختصر تعارف تحریر ہے۔ حافظ شیرازی کا اصل نام شمس الدین محمد حافظ تھا۔ ان کی پیدائش ۷۲۶ھ میں شیراز میں ہوئی جو ایران کے ایک مشہور شہر کا نام ہے۔ حافظ کے والدِ محترم کا نام بہاؤ الدین تھا جنہوں نے حافظ کی علمی تربیت اس زمانے کے مشہور علماء وفضلا کے زیرِ سایہ ہوئی۔ حافظ شیرازی نے قرآن شریف کو مکمل حفظ بھی کر لیا تھا اسی مناسبت سے انہوں نے اپنا تخلص حافظ رکھا۔

جس طرح اردو شعر وشاعری میں میر تقی میرؔ کو خدائے سخن کہا جاتا ہے اسی طرح فارسی شاعری میں بھی حافظ شیرازی کو خدائے سخن مانا جاتا ہے ۔ حافظ شیرازی نے بے شمار غزلیں کہیں ہیں لیکن اس کے علاوہ انہوں نے رباعیات، قطعات اور قصائد وغیرہ صنف میں بھی طبع آزمائی کی۔ ان کی وفات ۷۹۱ھ میں شیراز میں ہوئی، آج ان کا مزار خاص وعام کے لیے زیارت کا مرکز بنا ہوا ہے۔

نظم 'داغ' کے آخری شعر میں حالی کا تذکرہ ملتا ہے یہاں یہ مناسب ہو گا کہ ان کا اجمالی تعارف بھی بیان کیا جائے۔ مولانا الطاف حسین حالیؔ بیک وقت شاعر اور نقاد تھے ان کا جنم ۱۸۳۷ء میں پانی پت میں ہوا تھا۔ حالی جب نو برس کے ہی ہوئے تھے کہ ان کے والد خواجہ ایزد بخش کا انتقال ہو گیا۔ ان کی پرورش بڑے بھائی کے ذمہ آئی جنھوں نے بحسن وخوبی انجام دی۔ بچپن میں ہی انہوں نے قرآن شریف حفظ کیا نیز عربی وفارسی کی تعلیم حاصل کی۔ حالی کے نہ چاہتے ہوئے بھی ۱۷ سال کی عمر میں ان کی شادی کر دی گئی۔ بعدہٗ دلّی کا سفر کیا یہاں انھوں نے مزید اعلیٰ تعلیم کے حصول کی طرف قدم بڑھایا۔

حالیؔ ۱۸۵۶ء میں حصار 'ہریانہ' میں ملازمت اختیار کی لیکن کچھ عرصے بعد وہ پانی پت آ گئے اس کے بعد انہوں نے جہانگیر آباد کا رُخ کیا ۔ جہاں شیفتہ کی صحبت میں ان کی شاعری کی اصلاح ہوئی پس دہلی میں مقیم ہوئے جہاں مرزا غالب کی شاگردی حاصل کی۔ غالب کی وفات کے بعد حالی لاہور تشریف لے آئے جہاں انہوں نے محمد حسین آزادؔ کی مدد سے 'انجمنِ پنجاب' قائم کی۔ جس کے زیرِ سایہ نیچرل شاعری کی بنیاد رکھی۔ کچھ برس کے بعد دہلی آکر آباد ہوئے اور اینگلو عربک کالج میں استاد مقرر ہو گئے۔ ملازمت سے فراغت حاصل کرنے کے بعد اپنے آبائی وطن پانی پت میں زندگی کے آخری ایام گزارے اور وہیں ۳۱ر دسمبر ۱۹۰۴ء کو آخری سانس لی۔

مندرجہ بالا شعراء کے مختصر تعارف کے بعد اب نظم کے پہلے حصے پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اردو وفارسی شاعری کا مشہور ومعروف شاعر مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ کی موت پر آنسو بہائے گئے۔ شاعر کہتے ہیں کہ مرزا غالب اب ہمارے درمیاں نہیں ہیں۔ ایک زمانے سے باشندگانِ قبرستان میں شامل ہیں اور مرزا غالب کے خاص شاگرد میر مہدی مجروح بھی اس فانی دنیا سے رخصت ہو کر مالکِ حقیقی سے جا ملے۔ حضرت داغ دہلوی اور امیر مینائی کے درمیان اچھا خاصا یارانہ تھا۔ یہاں شاعر امیر مینائی کی وفات پر غم والم کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ پردیس میں ان کا انتقال ہو گیا اور اپنے وطن کی مٹی میں دفن نہ ہو سکے۔ لیکن آج بھی ان کی شاعری لوگوں کے دلوں میں نقش ہے۔ داغ جیسے عظیم ترین شاعر دنیا سے رخصت ہو گئے ہیں۔ گویا ایک روشن مینار منہدم ہو چکا ہے جس کے سبب سارا چمن ماتم میں غوطہ زن ہے۔ دنیائے شاعری آج ان کی وفات پر ماتم کر رہی ہے۔ داغ کی پیدائش دہلی میں ہوئی تھی اور یہیں ان کی شاعری کمال کو پہنچی ان کے ہم عصر کئی مشہور شعراء اس وقت دہلی میں موجود تھے ۔ تاہم پہلے حصے کے آخری شعر میں شاعر داغ کی وفات پر رنج وغم بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ داغ آج اپنے ربِّ حقیقی سے جا ملے ان کا جنازہ لوگوں

کے شانے کا حُسن بنا ہوا ہے جو حضرات ان کے جنازے میں شامل رہے ان کے لیے یہ بڑے ہی فخر کی بات رہی ہے۔ دہلی کا آخری شاعر داغ دہلوی نے شہر خموشاں میں اپنا گھر بنالیا ہے۔ ان کے بعد اب کوئی شاعر ان کے مقام کو نہ پہنچ سکا جو مقام اردو شاعری میں حضرتِ داغ دہلوی کو حاصل تھا۔

اس نظم کے دوسرے حصے میں شاعر یوں بیان کر رہے ہیں کہ داغ کی موت کے بعد اب دوسرے شاعروں کے کلام میں ان جیسا حسن و جمال باقی نہ رہا۔ وہ اپنی عمر کے آخری ایام میں ایسے کلام فرماتے تھے جس سے پتہ چلتا تھا کہ وہ شاعری کی دنیا میں ہمیشہ جواں نظر آتے تھے۔ داغ نے عشقیہ کلام کو جس حسن و خوبی اور سہل کے ساتھ اپنی شاعری میں پِرویا، وہ باکمال ہے۔ شاعر کہتے ہیں کہ داغ کی اس منزل تک ہماری رسائی نہ ہو سکی۔ اس سے ان کے کلام کی گہرائی و گیرائی کا پتہ چلتا ہے۔ اس حصے کے تیسرے اور چوتھے اشعار میں شاعر کہتے ہیں کہ داغ کے علاوہ صبحِ نسیم سے گُل کی خموشی کا راز کون دریافت کرے گا؟ اور وہ کون ہے؟ جو اس باغ کے بلبل کی آہ وزاری کی تصویر کشی کرے گا۔ داغ اس پایہ کے شاعر تھے جو تخیل کی بلند پروازی میں بھی کبھی راہِ حق سے انحراف نہیں کیا۔ نیز جس طرح طائر کی نگاہ پرواز میں بھی اپنے مسکن پر ہی رہتی ہے۔

نظم کے تیسرے حصے میں یہ بیان درج ہے کہ داغ کی شاعری میں جو حُسن و جمال، تخیل کی فلک رسائی اور زمانے کے رنج والم وغیرہ دکھائی دیتا ہے اس کی مثال دیگر شعراء کے یہاں نہیں ملتی۔ اس آباد ویرانے میں حافظ شیرازی جیسے شاعر مل جائیں گے اور شاعری کے ایسے ساحر ملیں گے جن کے یہاں شاعری کی بہترین مثال دکھائی دے گی۔ شاعری کی دنیا میں ایسے شاعر بھی نظر آئیں گے جو بالکل نئے طرز کی شاعری کا اظہار کریں گے۔ دل کی کتابوں کی بے شمار تفسیریں لکھی جائیں گی اور عین شباب کے خواب کی ان گنت تعبیریں تحریر کی جائیں گی لیکن داغ جیسی عشقیہ واردات کو اپنی شاعری میں بعینہٖ طریقے سے کون دکھائے گا۔ اب داغ جیسے عظیم شاعر باقی دنیا کی طرف منتقل کر گئے لیکن ان کے عشقیہ مضمون قلب و جگر پر گہرا اثر چھوڑ گئے، ان جیسی عشقیہ شاعری کی مثال اب دیگر شعراء کی شاعری میں ناپید ہے۔

چوتھا حصہ جو نظم کے موضوع کے لحاظ سے اہم ہے جس میں شاعر تحریر کرتے ہیں کہ بڑے ہی درد کی بات ہے کہ آج ہمارے درمیان داغ جیسے عظیم المرتبت شاعر نہیں رہے جن کے جانے سے مجھ کو اتنا غم ہوا ہے کہ آج میں اشک بار ہوں اور اشک کے دانے اردو شاعری کی زمین میں بکھیر رہا ہوں۔ یہاں شاعر داغ سے اپنے استادی و شاگردی کے رشتے کی وضاحت پیش کر رہے ہیں اور مزید اپنے نظریے کا اظہار کرتے ہیں کہ ہے اے دلّی میں آنسوؤں کا دریا بہا رہا ہوں اور تو بھی رو کہ اس عظیم شاعر کا تعلق تجھ سے ہی تو تھا۔ اس کے بعد شاعر فرماتے ہیں کہ اے دہلی تو اردو شعر و ادب کا

ہمیشہ سے مرکز بنا رہا ہے۔ آج تیرا گلستاں ویران ہو گیا ہے۔ چونکہ تیری محفل میں داغ جیسے بلند مرتبہ شاعر نہیں رہے جس سے اب تیری عظمت میں گرہن لگ گیا ہے۔ حضرت داغ تیری سرزمین میں ایک دلکش اور رنگین گل کی مانند تھے جو بوئے گل کی طرح تیرے صفحۂ قرطاس سے رخصت ہو گئے۔ بڑے تأسف اور ملال کا مقام ہے کہ آج اردو شاعری کا خانوادہ داغ سے خالی ہو گیا گویا داغ کو اردو شعر و شاعری سے بے حد شغف تھا۔ دہلی کی مٹی میں وہ خاص دلکشی نہ تھی جس وجہ سے وہ مہِ کامل دکن ہی میں سپردِ خاک ہو گئے۔ اس حصے کے آخر میں شاعر فرماتے ہیں کہ حضرت داغ دہلی کے بزمِ سخن کے روحِ رواں تھے اب اس جہاں سے کوچ کر گئے ہیں جس وجہ سے شعر و شاعری کی محفل ویران ہو گئی ہے اب اس جہاں آباد کی بزم میں صرف حالی کا نام باقی رہ گیا ہے۔ مثال کے لیے اشعار ملاحظہ فرمائیں

اشک کے دانے زمیں شعر میں بوتا ہوں میں
تو بھی رو اے خاکِ دلی داغ کو روتا ہوں میں

اے جہاں آباد سرمایۂ بزمِ سخن!
ہو گیا پھر آج کمالِ خزاں تیرا چمن !

وہ گلِ رنگیں ترا رخصت مثالِ بو ہوا
آہ ! خالی داغ سے کاشانۂ اردو ہوا

تھی نہ شاید کچھ کشش ایسی وطن کی خاک میں
وہ مہِ کامل ہوا پنہاں دکن کی خاک میں

مندرجہ بالا اشعار کے سلسلے سے ڈاکٹر خواجہ حمید یزدانی اس طرح رقم طراز ہیں:

"میں داغ کی وفات پر آنسو کے بیج شاعری کی زمین میں بو رہا ہوں (شعر میں صدمے کا اظہار کر رہا ہوں)اے دہلی کی سرزمین میں داغ کی وفات پر رو رہا ہوں تو بھی اس اپنے عظیم شاعر کے اٹھ جانے پر رو ،کیونکہ داغ کا اصل تعلق تجھ سے تھا۔

اے جہاں آباد دہلی تو کہ شعر وشاعری کی محفل کا سرمایہ ہے (تجھ میں بڑے بڑے شعراء پیدا ہوئے ہیں) آج تیرا چمن پھر خزاں کے ہاتھوں سے روندا گیا ہے۔ داغ کی وفات سے تیری عظمت میں فرق آگیا ہے۔

داغ ایک طرح سے رنگین پھول تھا جو خوشبو کی طرح رخصت ہو گیا۔ بڑی دکھ کی بات ہے کہ آج اردو کی محفل داغ سے خالی ہو گئی ہے۔ داغ کو اردو زبان پر بے حد عبور تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اپنے وطن دہلی میں ان کی کوئی خاص کشش نہ تھی اس لیے وہ چودھویں کا چاند دکن کی زمین میں چھپ گیا۔ داغ دکن میں فوت اور وہیں دفن ہوئے تھے۔"

(صفحہ نمبر ۱۴۸، شرح بانگِ درا۔ ڈاکٹر خواجہ حمید یزدانی)

اس نظم کے آخری حصے میں موت کے نظام کے سلسلے سے شاعر کہتے ہیں کہ موت اچانک آجاتی ہے بتا کر نہیں آتی۔ جس وجہ سے دلوں میں بہت ساری تمنائیں باقی رہ جاتی ہیں۔ موت ہمیشہ گھات لگائے رہتی ہے جب خدا کا حکم ہوتا ہے تو وہ فوراً روح قبض کر لیتی ہے۔ کسی بھی انسان کی اللہ تبارک وتعالیٰ سے شکایت کے لیے زبان نہیں کھل سکتی کیونکہ یہ قدرت کا نظام ہے کہ بنی آدم کے آنے جانے کا سلسلہ تا قیامت رواں دواں رہے گا۔ کائنات کی تمام شے کے لیے ایک ہی قانون ہے کہ اس جہاں میں ہر چیز فانی ہے گویا ربِ کریم کے علاوہ کوئی جاوداں نہیں ہے۔

الغرض علامہ اقبال اس نظم میں اپنے استادِ محترم حضرتِ داغ کی وفات پر ایک نوحہ تحریر کیے ہیں جس میں انھوں نے ان کی یاد میں آنسوں بہائے ہیں اور موت پر اپنے درد و غم کا اظہار بڑے فنکارانہ انداز میں کیا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں اپنے استاد سے بے پناہ محبت تھی۔ داغ دہلوی اپنے زمانے کے اردو بزمِ سخن کے اہم رکن تھے۔ ان کی رحلت سے اردو شعر وشاعری کی دنیا ویران سی ہو گئی۔ اب داغ جیسے عظیم المرتبت شاعر کی اعلیٰ پیمانے کے کلام کی مثال کہیں نہیں ملتی۔ اس کے علاوہ اس نظم میں علامہ اقبال نے مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ، میر مہدی مجروح اور امیر مینائی جیسے عظیم شعراء پر بھی آنسوں بہائے ہیں لیکن پوری نظم میں داغ کی موت پر ہی ماتم کا اظہار ہے۔ آخر میں حضرت داغ دہلوی کا ایک شعر ملاحظہ فرمائیں۔

اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغؔ
سارے جہاں میں دھوم ہماری زبان کی ہے

☆☆☆